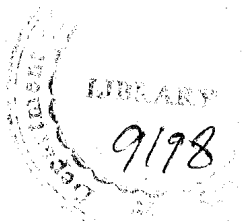

Al-Hikmat

Volume 23 (2003), pp. 1-7

عالمگیریت اور ثقافتی استعماریت

(Globalization and Cultural Imperialism)

نعیم احمد*

سامراجیت یا استعماریت کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ کسی ریاست کی ایسی حکمتِ عملی یا پالیسی ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ ریاست اپنی جغرافیائی سرحدوں سے باہر دیگر ممالک پر اپنا تسلط قائم کرتی ہے جبکہ ان ممالک کے عوام اس غلبہ واستیلاء کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔[1] غیر ممالک پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے سامراجی ریاست ہمیشہ ظلم وستم اور جور وجبر کے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ اس لئے بین الاقوامی اور عالمی ابلاغِ عامہ میں سامراج یا استعمار کی اصطلاح منفی اور غیر اخلاقی مفہوم اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ عالمی برادری میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کی خاطر سامراجی ریاست اپنے استعماری عزائم پر دوستی یا ہمدردی کا غلاف چڑھا دیتی ہے۔ کمزور اقوام میں تعلیم کے فروغ، افلاس کے انسداد، بیماریوں اور وباؤں کے قلع قمع اور معیشت کے استحکام کے پُرکشش منصوبوں کی آڑ میں ایسی معاشی، سیاسی اور ثقافتی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں جن سے کمزور اقوام کمزور تر ہوتی جاتی ہیں اور سامراجی ریاست زیادہ طاقتور ہوتی جاتی ہے۔ استعماری عزائم اکثر اوقات اتنے خوش نما اور متاثر کن نعروں میں مستور وملفوف ہوتے ہیں کہ ان کی مذموم، غیر اخلاقی اور انسانیت سوز نوعیت کا علم نہیں ہو پاتا۔ ان کے بارے میں تب شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں جب ایسی پالیسیاں ناکامی کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان سے مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہوتے۔ اس مخصوص مفہوم میں سامراجیت یا استعماریت کا فروغ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہوا، تاہم یہ تاریخ کے ہر دور میں موجود رہی ہے۔

---

*پروفیسر ڈاکٹر نعیم احمد، صدر، شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور-54590 (پاکستان)۔

یہ مقالہ پاکستان فلسفہ کانگرس کے 35ویں سالانہ اجلاس میں 16 مارچ 2002ء کو پڑھا گیا۔

سامراجیت کی طرح عالمگیریت (Globalization) کا رُجحان بھی تاریخ میں ہمیشہ موجود رہا ہے، بلکہ اگر عالمگیریت کو سامراجیت کی ہی ابتدائی شکل قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ عالمگیریت کے آثار ہمیں قدیم ترین اقوام میں بھی ملتے ہیں۔ قبل مسیحی دور میں مشرقی ایشیا کے اندر چین کی چاؤ چن (Chau Chin) اور ہان (Han) سلطنتیں وجود پذیر ہوئی تھیں۔ شمالی ہندوستان میں موریہ اور گپتا سلطنتیں اُبھری تھیں۔ اسی طرح میسوپوٹیمیا کی بابلی اور سمیری سلطنتیں قائم ہوئی تھیں۔[2] ان سب سلطنتوں کا بُنیادی خاصہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے اردگرد کے متعدد ممالک کو طاقت کے بل پر فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ قبل مسیحی عالمگیریت کی سب سے نمایاں مثال یونان کے سکندرِ اعظم کی ہے جو اپنی چھوٹی سی ریاست سے ساری دُنیا کو فتح کرنے نکلا تھا۔ وہ ساری دُنیا کو ایک جگ دیسی ریاست (Metropolis) بنانا چاہتا تھا جس میں اس کا اپنا وضع کردہ نظامِ حکومت قائم ہوتا۔ اس نے بلا شبہ اردگرد کے بہت سے ممالک کو بزورِ شمشیر فتح کر کے ہیلانیاتی ثقافت (Hellenistic Culture) کی داغ بیل ڈالی، تاہم اس کا پُوری دُنیا کو ایک ریاست بنا دینے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔

شہنشاہوں کی ہوسِ ملک گیری اور ذوقِ کشور کشائی مختلف تہذیبوں کی اثر آفرینی اور اثر پذیری کا سبب بنا۔ فاتح عساکر کے جلو میں غیر مرئی تہذیبی و ثقافتی عوامل بھی سفر کرتے تھے اور اجنبی سرزمین میں پہنچ کر جڑیں پکڑ لیتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ مفتوحہ ملک کی مقامی تہذیب پر فاتحین کی تہذیب و ثقافت غالب آ کر اس کا نام و نشان مٹا دیتی یا اس کے ساتھ مل کر ایک نئی تہذیب و ثقافت کو جنم دیتی۔

مختلف تہذیبوں کا اختلاط اور عالمگیریت کا فروغ صرف جنگوں سے ہی نہیں ہوا بلکہ اس میں تجارت نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔[3] مختلف ملکوں کے تاجر اپنے ہمراہ نہ صرف سامانِ تجارت لے کر سفر کرتے تھے، بلکہ وہ اپنی اپنی تہذیبی و ثقافتی روایتوں کے علمبردار بھی ہوتے تھے۔ اس طرح تجّار اپنی ملکی مصنوعات کو دیگر ممالک میں پہنچانے کے ساتھ ساتھ نئی سرزمین میں اپنی تہذیب و ثقافت کی تُخم ریزی بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ساحلی شہروں نے یا ایسے شہروں نے جو کہ تجارتی کاروانوں کی گزرگاہوں پر واقع تھے، تہذیبوں کے اختلاط اور عالمگیریت کے فروغ میں خاص کردار ادا کیا ہے۔

استعماریت خواہ قدیم ہو یا جدید، اس کا بُنیادی مقصد کمزور اقوام کا استحصال ہے۔ زمانۂ قدیم میں بادشاہوں کی ہوسِ اقتدار کو پُورا کرنے کے لئے ان کی افواج اپنے ملک سے نکل کر اردگرد کے ممالک کو تاخت و تاراج کرتیں اور ان کے وسائل لوٹ کر اپنے حاکموں کے خزانے بھرتیں۔ جدید دور میں بھی استعماریت کے پسِ پردہ محرکات وہی ہیں تاہم ان کے لئے کئی اخلاقی، معاشی اور ثقافتی جواز تراش لئے گئے ہیں۔ جب تک نوآبادیاتی نظام دُنیا میں قائم رہا اس وقت تک استحصالی اور استعماری نظام کی یہ شکل رائج رہی کہ حاکم ریاست عملی طور پر کمزور ریاست پر قابض ہوتی۔ Enlightenment کے دور میں یورپی اقوام کو غیر مغربی اقوام پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے بالادستی حاصل ہوگئی تھی۔ ایشیا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے کئی ممالک ان کے زیرِ نگیں آ گئے۔ برطانیہ نے ایک ایسی سلطنت تعمیر کر لی جس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ مغربی اقوام نے غیر مغربی اقوام کے نہ صرف وسائل پر قبضہ کرلیا بلکہ ان پر اپنی تہذیب وثقافت کے بھی گہرے نقوش ثبت کئے لیکن عالمی جنگوں کے اثرات سے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوگیا۔ مغربی اقوام کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ عملی طور پر اپنی نوآبادیوں پر قبضہ وتسلّط برقرار رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد اکثر افریقی اور ایشیائی ممالک کو آزادی اور خودمختاری ملنا شروع ہوگئی لیکن اب پُرانے شکاری نیا جال لے کر آئے۔ کہیں جمہوریت کے فروغ، کہیں تعلیمِ بالغاں اور کہیں انسانی حقوق کے تحفظ کے نام پر انہوں نے ایسی پالیسیاں مرتّب کیں کہ کمزور اقوام آزاد وخودمختار ہونے کے باوجود ان کے نادیدہ جال میں پھنس گئیں۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو تعمیرِ نو کے منصوبوں کے لئے بھاری قرضے جاری کئے گئے تاکہ وہ پُوری طرح استحصالی شکنجے میں جکڑے جائیں۔ اس طرح امریکہ اور یورپی اقوام کو ضرورت نہ رہی کہ وہ دوسرے ممالک میں اپنی فوجیں بھیج کر انہیں اپنے تابعِ فرماں کریں۔ انہیں غلام بنائے رکھنے کے لئے ان کی سیاسی ومعاشی پالیسیاں کافی تھیں۔

حال ہی میں ماحولیات کا تحفظ ایک ایسے بین الاقوامی آدرش کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے جو سارے کرۂ ارض کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) بنانے کا خواہاں ہے۔ یورپ اور امریکہ خود کو ساری دُنیا کے وسائل کے ٹھیکیدار سمجھنے لگے ہیں۔ اس ضمن میں ورلڈ واچ کے مراکز اور این جی اوز مختلف ممالک میں فعّال ہیں اور بظاہر انسانیت کی بھلائی اور کرۂ ارض کے تحفظ کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کر رہی

ہیں، لیکن در پردہ استحصالی قوّتوں کے استعماری عزائم کی تکمیل کر رہی ہیں۔

مغربی اقوام اور غیر مغربی اقوام میں اصل فرق و امتیاز مشین یا ٹیکنالوجی اور سائنس کا فرق ہے۔ یورپ میں صنعتی اِنقلاب کے بعد مشین منظرِ عام پر آئی۔ مشین کی ایجاد سے قبل یہ ممکن نہ تھا کہ وسیع پیمانے پر پیداوار حاصل کی جا سکے۔ مثلاً ایک سو کسانوں کی مدد سے ایک مخصوص قطعۂ اراضی سے محدود مقدار میں ہی گندم حاصل کی جا سکتی تھی کیونکہ آبپاشی کے لئے پانی محدود تھا اور کاشت کاری کے لئے زیادہ افرادی قوت درکار تھی۔ اسی طرح ایک آجر کے لئے دس جوتا ساز سارا دن کام کر کے پندرہ یا بیس جوڑی جوتے تیار کر سکتے تھے، لیکن مشین کی آمد سے وسیع و عریض قطعۂ اراضی زیرِ کاشت لایا جا سکتا ہے۔ پانی کی بہم رسانی بھی کوئی مسئلہ نہیں رہی اور محنت مشقت کے لئے زیادہ افراد کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اسی طرح ایک کاریگر ایک مشین پر کھڑا ہو کر دن بھر میں پندرہ بیس کی بجائے ایک ہزار جوتے بنا سکتا ہے۔ چنانچہ مشین کی آمد سے وہ پیداواری سطحیں جو قبل ازیں منجمد تھیں یکلخت حرکت پذیر ہو گئیں اور پیداوار میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ یہ پیداوار یورپی اقوام کی ضرورت سے زائد تھی۔ پہیّے کا کام چلنا ہے۔ جیسے جیسے یہ چلتا جائے گا ویسے ویسے پیداوار میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ میں زائد پیداوار (Overproduction) کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے غیر ملکی منڈیوں کی ضرورت تھی۔ افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا کی منڈیاں موجود تھیں، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان میں مشینی پیداوار کی طلب کیسے پیدا کی جائے۔ افریقہ اور ایشیا کی عورتیں تو اپنے صدیوں پُرانے بناؤ سنگھار کے طور طریقے اپنائے ہوئے تھیں۔ وہ یورپ کی تیار کردہ کریمیں، لپ اسٹکیں اور شیمپو وغیرہ کیوں خریدتیں۔

صارفیت (Consumerism) کے مقاصد کے لئے غیر مغربی ممالک میں مصنوعی طلب پیدا کی گئی۔ ان ممالک پر تہذیبی و ثقافتی یلغار کر دی گئی۔ اس ضمن میں میڈیا نے خاص کردار ادا کیا۔ اخبارات، رسائل و جرائد، ٹی وی اور فلم وغیرہ نے ہر محاذ پر یہ بالواسطہ تاثر دیا کہ سفید فام اقوام دُنیا کی بہترین اور قابلِ تقلید اقوام ہیں۔4 نتیجہ یہ نکلا کہ ریٹھوں سے بال دھونے والی خاتون اِمپورٹڈ شیمپو استعمال کرنے لگی اور نوجوان لڑکے جین، جیکٹ اور پاپ میوزک کے خبط میں مُبتلا ہو گئے۔ یہ ثقافتی استعماریت کا ایک مظہر تھا جس کے پسِ پردہ یہ محرک کارفرما تھا کہ مغرب کی زائد پیداوار کے لئے یہ کھپت کی منڈیاں بن جائیں۔ آج

دُنیا کے اکثر پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں غیر ملکی سرمائے سے چلنے والی NGOs اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان ممالک کی معیشت کا اس حد تک دارومدار غیر ملکی قرضوں اور امداد پر کر دیا گیا ہے کہ وہ نہ تو آزادانہ طور پر ترقی کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنا قومی تشخص بحال رکھ سکتے ہیں۔ ان ممالک کی خارجہ پالیسیوں کے خاکے بھی ان ممالک سے باہر کہیں اور تیار کئے جاتے ہیں۔ سیاسی و معاشی استحصال کے علاوہ ان ممالک میں ثقافتی اور تہذیبی یلغار اس شدّت سے جاری ہے کہ ان ممالک کے عوام اپنے گھروں میں ہی اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ علامہ ابنِ خلدون کے اس قول میں بڑی حد تک صداقت ہے کہ مفتوح اقوام فاتحین کی نقالی اور ان کے رنگ ڈھنگ اپنانے کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتی ہیں۔ چنانچہ ترقی پذیر اقوام کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان میں مغربی ثقافت کو فروغ دیا جا رہا ہے اور یہ تاثر عام کیا جا رہا ہے کہ کرۂ ارض ایک گاؤں یا ایک کنبہ بن چکا ہے۔

11 ستمبر 2001ء کے بعد عالمگیریت (Globalization) کی ایک نئی شکل دُنیا کے سامنے آئی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون سے مسافر بردار طیارے ٹکرانے اور وہاں ہونے والے ناقابلِ تصور جانی و مالی نقصان کو امریکہ نے دہشت گردی (Terrorism) کا نام دیا ہے۔ پھر اس نے افغانستان کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے، اس کے خلاف اِعلانِ جنگ کر دیا۔ نیٹو کے ممالک تو امریکہ کے حلیف تھے ہی، اس نے رُوس اور چین کو بھی اس اتحاد میں شریک ہونے کی دعوت دے دی۔ یورپ میں امریکہ کے خلاف جس سیاسی و اقتصادی اتحاد کی داغ بیل پڑ رہی تھی وہ بھی دم توڑ گئی۔

11 ستمبر کے بعد جاپان اور جرمنی بھی امریکہ کی حمایت پر مجبور ہو گئے۔ امریکہ نے اِعلان کر دیا کہ جو ملک دہشت گردی کے خلاف اس کی مہم میں شریک ہے وہ اس کا حلیف اور دوست ہے، بصورتِ دیگر اسے دُشمن تصور کیا جائے گا۔ سب ممالک دم سادھ کے بیٹھ گئے اور طوعاً و کرہاً امریکہ کے حلیف بننے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح امریکہ نے ایک یکسر نئے انداز میں عالمی اتحاد قائم کیا۔ یہ اتحاد دہشت گردی کے خلاف تھا۔ اس پر کوئی بھی انگشت نمائی نہیں کر سکتا تھا۔ امریکہ نے ایک ایسے ملک پر حملہ کر دیا جس کے پاس نہ کوئی فضائیہ تھی نہ بحریہ، نہ بڑے بڑے شاپنگ سنٹر اور پلازے تھے اور نہ کوئی قابلِ ذکر مواصلاتی نظام تھا۔ سنگلاخ اور بنجر پہاڑوں پر انسدادِ دہشت گردی کے نام سے لاکھوں ٹن بارُود برسایا گیا اور دُنیا کے تمام

ممالک کو اس عمل کو سراہنے پر مجبور کیا گیا۔ بقول نوم چومسکی (Noam Chomsky) یہ امریکہ کی سب سے بڑی دہشت گردی تھی جو انسدادِ دہشت گردی کے نام پر کی گئی۔[5]

اسامہ بن لادن کو مروانا امریکہ کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ سی آئی اے کے چند آزمودہ ایجنٹ اس کو اس کے ٹھکانے پر قتل کر سکتے تھے۔ اتنے بڑے اقدام کا محرک دراصل کچھ اور تھا۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ 2015ء تک دُنیا کے تیل کے ذخائر نصف رہ جائیں گے۔ اس وقت امریکہ وہ واحد ملک ہے جو تیل کا سب سے بڑا صارف ہے۔ ادھر ترکمانستان، ازبکستان اور قازقستان میں تیل کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ صرف ترکمانستان میں جو تیل کا ذخیرہ موجود ہے، اسے دُنیا کا تیسرا بڑا ذخیرہ قرار دیا گیا ہے۔ افغانستان پر وحشیانہ بمباری کے پس پردہ استعماری عزائم یہ ہیں کہ ان ذخائر کو قبضے میں کر لیا جائے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد اب دُنیا میں ایک سُپر پاور امریکہ رہ گئی ہے۔ اس نے اپنے تسلّط کے سائے ہر طرف پھیلا دیئے ہیں۔ فوجی، اقتصادی اور سیاسی طور پر یہ تمام اقوام کو اپنے زیرِ نگین کر چُکا ہے۔ پوری دُنیا کے وسائل کو یہ اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور ایٹمی ہتھیاروں کو نادان قوموں کی تحویل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ تہذیبی اور ثقافتی طور پر اس کی جڑیں بتدریج دُنیا کی تمام تہذیبوں کے اندر بہت گہری اتر چکی ہیں۔ بظاہر امریکہ جمہوریت، آزادی اور انسانی حقوق جیسی اعلیٰ اقدار کا پرچار کر رہا ہے اور انہی کے نام سے اپنا ورلڈ آرڈر مرتّب کر رہا ہے، مگر بباطن صرف اپنے مخصوص مفادات کے لئے ہی سرگرم و فعال ہے۔ جہاں کہیں اسے مزاحمت کے آثار ملتے ہیں انہی کے نام پر کارپٹ بمبنگ کرتا ہے اور ڈیزی کٹر گراتا ہے۔ شاید اسی کے لئے علامہ اِقبالؒ نے یہ شعر کہا تھا:[6]

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

حواشی

1 "The word "imperialism" is widely used as an emotive -- and more rarely as a theoretical -- term to denote specific forms of aggressive behaviour on the part of certain states against others; the concept refers primarily to attempts to establish or retain formal sovereignty over subordinate political societies, but it is also often equated with the exercise of any form of political control or influence by one political community over another." (*International Encyclopedia of the Social Sciences*, David L. Sills (editor), Macmillan Company and the Free Press, USA, 1966, Volume 7, p. 101)

2 مرتضیٰ احمد خاں، تاریخ اقوام عالم۔ مجلس ترقی ادب، لاہور، ص85۔

3 DeLacy O'Leary, D. D. (1957), *How Greek Science Passed to the Arabs*. Routledge and Kegan Paul Ltd., London, p. 1.

4 مزید تفصیل کے لئے دیکھئے "جدیدیت، صارفیت کا دوسرا نام" در تھذیب، جدیدیت اور ھم، منتخب مضامین از ڈاکٹر علی شریعتی۔ ترجمہ سعادت سعید۔ اقبال شریعتی فاؤنڈیشن، لاہور۔

5 مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے:

Noam Chomsky, *Rogue States*. Bluto Press, London.

6 اِقبال، بانگِ درا۔ اقبال اکیڈیمی، لاہور، ص274۔